تبصرہ

افریقہ - ایک چیلنج

احمد عبداللہ المسدوسی

مکتبہ خدام ملت — کراچی پاکستان
طبع اول - مارچ سنہ ۱۹۶۳ع صفحات ۵۱۲ - قیمت ۱۲ روپیے

عبداللہ المسدوسی کی یہ تصنیف افریقہ کے تاریخی اور سیاسی جائزہ پر مشتمل ہے - صاحب موصوف اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ بین الاقوامی اور بین النظریاتی کشمکش کے اس دور میں ملت اسلامیہ کے لئے افریقہ کے مسائل بہت بڑا چیلنج ہیں - افریقہ کو یہ امتیاز اب بھی حاصل ہے کہ آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے اسلام ہی یہاں کا سب سے بڑا مذہب ہے - مگر افریقی اقوام کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کے لئے نصرانیت ہر داؤں بازی پر لگائے ہوئے ہے - اگر اہل اسلام نے غفلت کی تو ممکن ہے ابھرتی ہوئی افریقی قومیں نصرانیت کے دامن میں سایۂ عاطفیت تلاش کریں اور وسیلہ ارتقاء و ترقی سمجھکر اسے قبول کرلیں - زیر تبصرہ کتاب اسی زاویہ نگاہ سے قلمبند کی گئی ہے - حصہ اول میں افریقہ کا عام جغرافی، معاشی، تاریخی، لسانی اور مذہبی پہلوؤں سے تعارف ہے - حصہ دوم مذاہب اور تبلیغی مساعی کے لئے وقف ہے اور حصہ سوم میں افریقہ کے مستقبل کی صورت گری کا تجزیہ ہے -

افریقہ کی تاریخ مصنف نے طلوع اسلام سے بیان کی ہے - انہوں نے واضح کیا ہے کہ افریقہ چار ادوار سے گزر چکا ہے - پہلا دور ۶۳۸ تا ۱۰۷۰ع تک رہا جس میں شمالی افریقہ قلمرو اسلامیہ کا جز بن گیا - ۱۰۷۰ تا ۱۷۵۰ع کا دور قریباً ایک ہزار سال پر محیط ہے - اس عرصہ میں کئی مقامی مسلم ریاستیں وجود میں آئیں - چنانچہ مملکت سودان کے علاقوں میں مالی، سینگال، گیمبیا اور گینیا کے علاقہ شامل تھے - مسلمان بربر شمالی حصہ سے گزر کر صحرائے افریقہ کے اقطاع میں حکمران بن چکے تھے - دوسری طرف مشرقی افریقہ کے ساحل پر اریٹریا اور سمالی لینڈ سے آگے بڑھتے ہوئے کینیا، زنجبار اور موزنبیق پر چھا گئے - اسکے بعد رفتہ رفتہ مسلم معاشرہ زوال پذیر ہوا اور

سترھویں صدی سے سیاسی اقتدار میں بھی انقباظ پیدا ہوگیا۔ چنانچہ سینگال پر غیر مسلم باشندے قابض ہوگئے۔ سنہ ۱۷۵۰ع تک موزمبیق، کینیا اور یوگنڈا کے بعض ساحلی شہر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے جہاں یورپی سامراج نے مختلف حصوں میں قدم جما لئے۔ اس سے تیسرا دور شروع ہوتا ہے جو مغربی سامراج کے عروج کی داستان ہے۔ مصنف نے مسلمانوں کے زوال کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ انہوں نے اسکا سبب خلافت کا انتشار قرار دیا ہے جس سے نہ صرف خلافت ٹوٹ کر دو حصوں یعنی عباسی اور اندلسی خلافتوں میں بٹ گئی بلکہ بعد کے دور میں خود مختار سلطنتیں معرض وجود میں آگئیں اور ملت اسلامیہ کئی سیاسی وحدتوں میں تقسیم ہوگئی جنکا خلافت سے برائے نام تعلق رہا۔ سقوط اندلس کے بعد جب عثمانی خلافت عباسیوں کی وارث بنی تو مصنف نے بڑے تاسف کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ مغلیہ ہند نے اسکی سیادت کبھی تسلیم نہیں کی نہ سلطنت ایران نے۔ اسلام کے عروج اور زوال کا یہ تجزیہ بلا شبہ نہایت غیر اطمینان بخش اور سطحی ہے۔ خلافت کا ''خلافت راشدہ،، سے مسخ ہوکر ''خاندانی ریاست،، میں تبدیل ہونا اور اس خاندانی ریاست کا بھی بہت سی ''خود مختار علاقہ واری سلطنتوں،، میں انتشار پذیر ہوکر ایک دوسرے کی کمزوری کا باعث ہونا اصل اسباب یا نتائج زوال کے محض ظاہری آثار و علامات ہیں۔

مصنف نے بحری طاقت کے فقدان کو مسلمانوں کے زوال کا بہت بڑا سبب قرار دیا ہے۔ بلا شبہ ہمیشہ یہ ایک فوری سبب رہا ہے۔ جب بحری مسابقت کا معاملہ رہا اور فوری کاروائی کی ضرورت پیش آئی تو یورپین اقوام نے بالادستی کا ثبوت دیا۔ لیکن پھر بھی اس سبب کو ملی عروج و زوال کے طویل المیعاد اور عظیم عوامل کا سا درجہ حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ بری طاقتوں کی حیثیت سے بھی مسلم مملکتیں اپنی طاقت و قوت برقرار نہ رکھ سکیں۔ اسباب کچھ اور زیادہ گہری نوعیت کے ہی ہوسکتے ہیں جنہوں نے ملت اسلامیہ کی وحدت، اسکی امتیازی معاشرتی شان، معاشی ڈھانچہ، انفرادی حوصلہ مندی اور اخلاقی قدروں کو مٹا یا میٹ کردیا۔

افریقہ کی تاریخ کا تیسرا دور ۱۷۵۰ تا ۱۹۰۱ع ہے جو مغربی اقوام کی زبردست ترقی اور افریقہ میں انکی حکومت کی توسیع کا دور ہے۔ چونکہ مسلم اقوام ہی افریقہ میں سب سے زیادہ منظم تھیں، ان کے پاس اہم علاقوں کی حکومتیں تھیں اسلئے اسلام اور مسلمان ہی اس استعماری یلغار کے سب سے بڑے نشانہ

اور حریف ثابت ہوئے۔ ۱۹۰۱ع تک مقامی اسلامی حکومتوں کا خاتمہ ہوگیا اور مغربی اقوام کی نوآبادیات میں ان کے علاقے شامل کر لئے گئے۔ علاوہ ازیں شمالی افریقہ پر فرانس قابض ہوگیا، مصر پر انگریزوں کی بالادستی قائم ہوگئی۔ اور سنہ ۱۹۱۹ع تک یہ صورت ہوئی کہ چپہ چپہ اقوام مغرب کے زیر نگیں آگیا۔ اس سیاسی تسلط کے جلو میں نصرانی مبلغین کا گویا سیلاب آگیا۔ افریقی اقوام کے مذاہب تبدیل کرنے کی کوشش ہر جگہ سرکاری و نیم سرکاری مشنری کا جز بن گئیں۔ اس صورت میں افریقی مسلمانوں نے بھی اپنی سی کوششیں کیں چنانچہ افریقہ کی سرزمین پر تبلیغی سطح پر اسوقت صلیب و ہلال آپس میں نبرد آزما ہیں۔

یہ بات غیر معمولی نوعیت کی ہے کہ مغربی اقوام نے اسلام کے استیصال کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ فرانس نے اپنے مقبوضہ علاقوں میں جو سابق میں مسلم مملکتوں میں شامل رہے ہیں مثلاً مغربی افریقہ کے مقبوضات میں عربی زبان کی تدریس تک کی ممانعت کردی تھی، جبکہ افریقہ کی کئی مقامی زبانیں عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھیں اور خود پڑھے لکھے لوگوں کی زبان عربی ہوا کرتی تھی۔ مگر مدارس میں عربی کی تعلیم ممنوع کرکے انہوں نے نہ صرف عربی بلکہ اشاعت اسلام کو روکنے کی کوشش کی۔ اسی طرح بیاجئیم کے مقبوضات میں ہوا۔ وہاں تبلیغ اسلام یا اشاعت قرآن و حدیث کی ممانعت رہی ہے۔ انگریزی مقبوضات میں سرد مہری کا ثبوت دیا جاتا رہا مگر قانونی مزاحمت مسلمانوں کے راستہ میں نہیں کھڑی کی گئیں۔ اگرچہ نصرانی تبلیغی مشنوں کو سرکاری سرپرستی حاصل رہی اور مسلمان مبلغین کے ساتھ غیر ہمدردانہ برتاؤ ہوتا رہا مگر پھر بھی رواداری کے معاملہ میں انگریزی سامراج دوسروں سے بہتر تھا۔

باوجود اسکے کہ پورے افریقہ میں سب نصرانی مغربی حکومتوں کی کوششیں تبدیل مذہب میں لگی رہیں اور کم از کم دیڑھ سو سال تک پوری قوت سے جاری رہیں، تبدیل مذہب کرنے والوں کے لئے ترجیحی سلوک کا لالچ بھی ہمیشہ انکے ہمراہ رہا مگر اسکے باوجود یہ مساعی بڑی حد تک ناکامی سے ہمکنار ہوئیں۔

عبداللہ المسدوسی نے بڑی بصیرت کے ساتھ اس صورت حال کا تجزیہ کیا ہے جو اہل اسلام کی تبلیغی مساعی کے لئے سبق آموز ہے۔ نصرانیوں کے

لئے سب سے بڑی رکاوٹ خود انکا رویہ ثابت ہوا۔ افریقہ میں عیسائیت ملک گیری کی ہوس کی صورت میں پہنچی۔ نیز اسکا دامن نسلی امتیازات سے مملو تھا۔ وسائل ترقی و دولت مغربیوں کی فلاح و خوشحالی کے لئے وقف کرنا اسکا مسلک تھا اور مقامی باشندوں کو مزید پستی میں ڈالنا، انکی رفاہ سے بے تعلق ہونا، اور خود تعلیم سے بے بہرہ رکھنا اسکی حکمت عملی تھی۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ نصوانیت کے پیام میں دنیاوی و آخروی نجات کا کوئی سامان مشکل سے اہل افریقہ کو نظر آتا تھا۔ افریقی اس فاصلہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکے جو ایک دیسی عیسائی اور فرنگی عیسائی کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ یہی وہ بنیادی سبب ہے کہ عیسائیت جاہ و حشمت کی فراوانی کے باوجود افریقیوں کی نظر میں نہ سما سکی۔

اسکے برخلاف مسلمان مبلغین کی مساعی بے سرو سامانی کے باوجود امید افزا رہی ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ افریقہ میں اسلام کی علمبرداری بے غرض درویشوں نے کی ہے، نیز افریقیوں سے برادرانہ برتاؤ کرنا مسلمان مبلغین کا شیوا رہا ہے۔ لیکن اب افریقہ کی بدلتی ہوئی صورت حال عیسائیت کے بھی موافق ہو رہی ہے۔ فرنگی نصرانی کئی افریقی علاقوں سے ہٹ گئے ہیں۔ انکے استیصالی کردار نے بین ریاستی تعلقات و امداد کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ اسلئے اب وہ حالات ہی نہیں رہے جن سے عیسائی مبلغین غیر ملکی حاکمیت کے ساتھ افریقیوں کے ذہن میں مشروط ہوا کرتے تھے۔ اب مقابلہ ایک مذہب کی تبلیغ اور دوسرے مذہب کی تبلیغ کے درمیان خالص ہو کر آپڑا ہے۔

افریقہ کے نئے سیاسی نقشہ پر بہت سی چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستیں نمودار ہوئی ہیں۔ انکے فوری مسائل قومی وسائل کی ترقی، تعلیم، متمدن زندگی کا حصول اور غیر ملکی امداد سے رفتہ رفتہ آزاد ہونا ہے۔ عبداللہ المسدوسی فرماتے ہیں کہ افریقہ میں اشاعت اسلام ان مقرون مسائل سے وابستہ ہو کر ہی فروغ پاسکتی ہے۔ افریقیوں کے بڑھتے ہوئے شعور کی ہمت افزائی، انکی ریاستی تنظیموں کے قیام میں امداد، اور مسائل کے حل میں ہمدردی کا ثبوت دیکر ہی اب اہل اسلام نصرانیوں سے بازی لیجا سکتے ہیں۔ مغربی استعمار نے رخصت ہوتے ہوتے جو افریقہ کو بہت سے آزاد ٹکڑوں میں پارا پارا کردیا ہے وہ افریقیوں کے لئے بڑا مسئلہ ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ ان شیرازوں کو وحدت میں پرونے کی کوشش میں افریقیوں کا پورا ساتھ دیں۔ اسوقت افریقہ میں لسانی اور علاقہ واری بنیادوں پر مختلف اتحاد اور وفاق قائم کرنے کی سرگرمیاں

غروج پر ھیں ۔ اس قسم کی سرگرمیاں افریقہ کی فلاح کے لئے بہت ضروری ھیں جنکے لئے مغربی ریشہ دوانیاں بہت بڑی رکاوٹ ھیں ۔ اھل اسلام کو اس پوری افریقی زندگی میں، اسکے روز مرہ کے مسائل میں شریک ھوکر افریقہ کو ابھرنے کے مواقع دینا چاھیں ۔

عبداللہ المسدوسی نے بہت وضاحت سے بیدار ھوتے ھوئے افریقہ کے تقاضوں کی تشریح کی ھے ۔ سچ مچ اھل افریقہ کی پست اقوام کو نئے طرز زندگی کی تلاش ھے، نئے نظریات و آدرشوں، رسوم و رواج، روایات اور منہاجات کی جستجو ھے ۔ اسلام اپنی آفاقی خصوصیات کی بناء پر روح افریقہ کی پیاس بجھا سکتا ھے ۔ مگر شرط یہ ھے کہ مسلمان افریقہ کی اس طلب کو سمجھیں، اسکی کیفیت و مزاج کو پرچانا جان لیں اور اس غرض کے لئے اپنے وسائل کا ایک حصہ وقف کریں ۔ افریقیات کو بطور علم مدون کرکے اسکی تعلیم کے مراکز قائم کریں، نیز افریقی اقوام کی زبان و تاریخ، تمدن و ثقافت کے علوم کی بھی درسگاھیں قائم کریں اور مبلغین کی ایسی جماعتیں تیار کریں جو نہ صرف علوم دینیہ سے واقف ھوں بلکہ ان علوم سے بھی آراستہ ھوں جن سے اھل افریقہ کو وہ سمجھ سکتے ھوں ۔ نہ صرف یہ بلکہ ان میں افریقی اقوام کی خدمت اور ان کی امنگوں کا شریک حال ھونے کی سچی لگن ھو ۔

''افریقہ ایک چیلنج،، اپنے عظیم الشان مقصد کی روشنی میں سچ مچ ایک بروقت اور معرکۃ الاراٗ کتاب ھے ۔ اھل ھند و پاکستان کو یعنی اردو بولنے والے مسلمانوں کو اسکی واقعی ضرورت تھی ۔ اس میں افریقیوں کے لئے خلوص اور مسلمانوں کے لئے درس عمل ھے ۔ اس کتاب کی جان سچی انسانی ھمدردی کا جذبہ ھے جو اسکے ھر باب سے عیاں ھے ۔

(ابو یحییٰ مصطفیٰ)

پاکستانی کلچر : قومی تشکیل کا مسئلہ
جمیل جالبی
مشتاق بک ڈپو۔ کراچی
قیمت آٹھ روپیہ، ص ۲۴۴، ۱۹۶۴ء

''پاکستانی کلچر،، اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد تصنیف ہے۔ جمیل جالبی اسکے مقدمہ میں رقمطراز ہیں کہ ''یہ موضوع میرے لئے میری اپنی بقا کا مسئلہ ہے،،۔ باب اول میں اسکی تشریح وہ یوں کرتے ہیں: ''ہمارے پاس کوئی تہذیبی سرمایہ ایسا نہیں ہے جس سے ہم اس چیلنج کو قبول کرسکیں جو آزادی اپنے ساتھ لائی ہے۔ مروجہ مذہب کا اخلاق و تہذیبی سرمایہ بظاہر ہمارا ساتھ دینے کے باوجود اپنی چمک دمک گنوا رہا ہے۔ آزادی سے پہلے ہمارے سارے جذبات اجتماعی تھے۔ آزادی کے بعد اجتماعی جذبات کا رنگ اڑنے لگا اور معاشرہ کی ہر سطح پر یہ احساس شدت کے ساتھ ابھرنے لگا کہ آخر وہ کون سے اجزاء ہیں جنکے ذریعہ ہم یک جہتی اور حقیقی اتحاد حاصل کرکے ایک قوم بن سکتے ہیں،،۔ یہ واقعی مہتم بالشان مسئلہ ہے جس سے عہدہ برا ہونے کی کوشش اس تصنیف میں کی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پرانا ڈھانچہ تیزی سے ڈھے رہا ہے۔ ہماری مجلسی زندگی خزاں رسیدہ درخت کی سی ہوگئی ہے اور ہماری معاشرت تہذیبی خلاء کا شکار ہو کر انتشار اور بد ہئیتی کا نظارہ دکھا رہی ہے مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ تہذیبی سطح پر ''اقدار و اخلاق کا کوئی ایسا نظام نہیں ہے جسپر ہم مثبت طریقہ سے زندگی کا کوئی فلسفہ تعمیر کرسکیں،، بجائے خود ایک جذباتی رد عمل ہے جس میں وہ کرب اور بیچینی تو چھلکتی ہے جسکا ثمر یہ کتاب ہے مگر اس آگہی و دانش کا فقدان ہے جسکا حاصل اس کتاب کو ہونا چاہئیے تھا۔ تہذیبی خلا صرف جمیل جالبی ہی نے محسوس نہیں کیا، بہت پہلے کئی اور ارباب نظر نے اسکو محسوس کیا تھا۔ حصول آزادی کے بعد خود پاکستان کے اہل ادب و دانش، علم و نظر کی معتدبہ تعداد نے اس اخلاق و اقداری نظام کی تحقیق و تفتیش پر خاصہ کام کیا ہے جس سے ہماری زندگی مثبت طور پر اپنی اس آزادی نو کا بار گراں اٹھانے کے قابل ہوسکتی ہے۔ مگر چونکہ مصنف نے صرف اپنا کرب دوسروں

تک منتقل کرنے کی سعی کی ہے، ادرکات کی بجائے تاثرات، تصورات کی بجائے جذبات، وجدانات کی بجائے ارتسامات کو مایۂ تحریر بنایا ہے اور بقول خود انہیں کے ''مسائل اور خیال کے اس جنگل میں تنہا سیر کی ہے،،۔ اس وجہ سے ان کی یہ تصنیف نہ ہمارے ادب کا آئینہ ہے اور نہ ہی اس میں وہ ارتقائے فکر پایا جاتا ہے جس سے ہمارا موجودہ دور بہرہ مند ہے۔ چنانچہ جمیل جالبی کی یہ نگارش صرف اندرونی ہیجان کا دھواں ہے نہ کہ قومی شعور کے لئے ایک اگلا قدم۔ اس دھوئیں میں کہیں تو ایلیٹ کی صورت نظر آتی ہے کہیں شوئی ٹزر کی، تو کہیں ازرا پانڈ کی۔

ہر ایسی تصنیف کے لئے جسکے عنوان ایسے بھاری بھرکم ہوں جیسے کہ (۱) آزادی، تہذیبی مسائل اور تضاد (۲) کلچر کیا ہے؟ (۳) قومی یک جہتی کے مسائل (۴) مذہب اور کلچر (۵) مادی ترقی اور کلچر کا ارتقاء (۶) مشترک کلچر، مشترک زبان (۷) تہذیبی آزادی اور تہذیبی عوامل (۸) نئے شعور کا مسئلہ وغیرہ، حقیقت یہ ہے کہ خود پاکستانی علمی و ادبی روایات و رجحانات تحقیقات و انتاجات کا عمیق مطالعہ اور یہاں کے نظام ہائے معاشرت کا رچا ہوا مشاہدہ شرط اولین ہیں، جب ہی وہ ''ادب سبک سیر،، کے درجہ سے بلند تر مقام کی حقدار ہوسکتی ہے۔ یہاں پر اس امر کی طرف اشارہ بیجا نہ ہوگا کہ پاکستان کے ادیبوں، نقادوں اور فنکاروں نے یہاں کی عمرانی شکست و ریخت، معیارات کی تبدیلیوں، اقداری انتشار و تصادم کے نہ صرف بیش بہا مرقع پیش کئے ہیں بلکہ تعمیر نو کے خدو خال نمایاں کرنے میں بھی قابل قدر حصہ لیا ہے۔ پاکستان کے مفکرین نے سماجی حرکیات، عمرانی احصاء اقداریات کے ابواب نیز مذہبی تحریکات و تعقلات کے سلسلہ میں بھی نہایت قیمتی ادب کا اضافہ کیا ہے جس سے مستفید نہ ہونا یا تو ناقابل معافی غفلت ہے یا کم سے کم ایک بھول۔ کیا اقبال کا فکر اور اسلام پر کام کرنے والوں کی ذہنی کاوشوں اس خلاء کو پر نہیں کرتیں؟

جمیل جالبی کی اس تصنیف کو اس بنیادی کم مائیگی کے باوجود پسند ہی کیا جائیگا اسلئے کہ انشائیہ کا یہ ایسا دلفریب نمونہ ہے جسکے اسلوب میں غضب کی وارفتگی ہے۔ اس وارفتہ بیانی میں قومی استحکام کی بعض جدید ترین کوششوں پر جو تبصرے نکل گئے ہیں وہ قابل داد ہیں۔

''۱۴ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اس نوزائیدہ ملک کا تعارف بیرونی دنیا سے کس طرح اور کس طور پر کرایا جائے۔

چونکہ حریف اور مدمقابل ہندوستان تھا جسکا کلچر صدیوں پرانا تھا ..... اسلئے ..... تاج محل، دھلی کی جامع مسجد، قوۃ الاسلام کے مینار وغیرہ (جو مسلم کلچر کی زندہ علامات ہیں) کے مقابلہ میں ہم نے موھنجو دڑو، ھڑاپا، ٹکسلا، گندھارا وغیرہ پیش کئے تاکہ دنیا ھماری قدامت و عظمت سے واقف ھو جائے۔ اس سلسلہ میں اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ ان عظیم تہذیبوں کا ڈھانچہ ھمیں بطور ورثہ ملا ھے،،۔ جمیل جالبی کہتے ھیں کہ یہ پہلی ''غلطی تھی جس نے 'ھند مسلم ثقافت' سے ھمارا رشتہ ضعیف کرنا شروع کیا ھے۔ برصغیر کی تقسیم کے ساتھ ساتھ ھم نے اپنے ذھنی و روحانی، تہذیبی و تاریخی روائت کی بھی تقسیم کردی اور خود کو یہ سمجھانے لگے کہ ھمارے تاریخی ورثہ اور روائت کے جو مظہر ھندوستان میں رہ گئے ھیں وہ ھندوستان کی تاریخ و روائت کا حصہ ھیں۔ 'ھند مسلم ثقافت' سے تہذیبی رشتہ منقطع کرنے کے ذھنی رویہ کا نتیجہ یہ ھوا کہ ھمارے آگے پیچھے کی ساری سیڑھیاں غائب ھوگئیں اور ھم کھلے صحرا میں اکیلے رہ گئے۔ موھنجو دڑو، ھڑاپا، منیاماتی اور گندھارا کی تہذیبوں سے ھمارا اتنا بھی تعلق نہیں جتنا فراعنۂ مصر کی تہذیب سے جدید مصر کا یا عہد جاھلیت کی تہذیب سے عرب کا۔ آخر سوچنے کی بات ھے کہ صرف برتنوں کی نقش گری اور اسکے نمونوں میں ھم اپنے روحانی رشتے کیسے تلاش کرسکتے ھیں؟ دراصل بنیادی مسئلہ تو روحانی تجربے، تاریخ اور روائت کا مسئلہ ھے اور یہی معیار ھے،،۔

جمیل جالبی اس معیار کے ذریعہ ھماری قومی عینیت اور تہذیبی وحدت کی اصل دریافت کرنے کی کوشش کرتے ھیں اور اس ضمن میں ''ھند مسلم ثقافت،، کا نظریہ پیش کرتے ھیں۔ وہ کہتے ھیں: ''ھم پاکستان کے باشندے اس ھند مسلم ثقافت کے وارث اور جانشین ھیں جو اس برصغیر میں مسلمانوں کے ایک ھزار سالہ دور حکومت میں یہاں کی فضا، مزاج، آب و ھوا اور میل جول کے زیر اثر پروان چڑھی ھے، جس میں عربوں کا مذھبی جوش اور آدرش بھی شامل ھے اور افغانوں، ایرانیوں، ترکمانوں اور مغلوں کا مزاج نہ صرف یہ بلکہ جس کی روح نے ان سب اجزاء کے میل سے تہذیب کا ایک ایسا نمونہ پیدا کیا جو کم و بیش آج برصغیر کی زندہ تہذیب کی بنیاد ھے.... آج بھی ھمارا لباس، ھمارا رھن سہن، ھمارے کھانے، ھمارے آداب معاشرت، ھمارے روز مرہ کے اوزار، ھمارے رسم و رواج، ھماری مصوری، ھماری شاعری اور ھمارا مزاج اسی تہذیب کی بنیاد پر قائم ھے۔ یہی وہ تہذیبی ورثہ ھے جس میں پاکستان کے سارے لوگ مشترک طور پر مزاجاً اور عملاً شریک ھیں

ہم اس نظریہ پر ہی یہاں مختصراً بھی تبصرہ کرسکتے ہیں کہ ''ہند مسلم ثقافت،، ایک اصطلاح ضرور بن سکتی ہے جو فنون لطیفہ خاص طور پر از قسم موسیقی و تعمیرات مفید مطلب بھی ہوسکتی ہے ۔ لیکن اس سے مراد کبھی کوئی تاریخی مظہر نہیں ہوسکتا ۔ ثقافتوں کی طویل تاریخ میں اس قبیل کا کوئی مخصوص کل منصۂ شہود پر نہیں آیا ۔ یہ تجربہ کہ ہندو اور مسلمان کا فرق کشمیر سے لیکر راس کماری تک گلی گلی، گاؤں گاؤں محسوس ہوتا ہے، صرف اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے ہر جگہ جدا رہے ۔ ہر مقام پر ان کی مجلسی زندگی میں باہم امتیاز رہا ۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ ہندی مسلمانوں کی تہذیبی میراث واحد ہے جسکی اپنی منفرد حیثیت ہے، اس قسم کی کسی مربوط سالمیت کا پتہ یہاں نہیں چل سکتا ۔ جمیل جالبی نے جس ثقافتی میراث کی طرف اشارہ کیا ہے وہ فی الاصل دہلی و نواح دہلی کا تہذیبی ورثہ ہے جس میں بہت زیادہ وسعت دیجیے تو اودھ کو اور شامل کرلیجئے جس کے اندر مغلوں، ترکمانوں ایرانیوں کا اچھا برا سب ہی شامل ہے ۔ اس تہذیبی ملغوبہ سے وادی مہران و برہم پترا کا کیا علاقہ ؟ جس میراث کو جمیل جالبی اپنی بتاتے ہیں اور پاکستان کی ثقافت کی عین و حقیقت قرار دینا چاہتے ہیں اگر اسکا نقطۂ آغاز غوری کا حملہ قرار دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شروع سے ہی ''انحطاط،، پر اسکی بنیاد ہے ۔ عالم اسلامی اسوقت تراج کی کیفیت میں تھا جب ہند میں مسلم غلبہ کا آغاز ہوا ۔ اسلامی قدریں مسخ ہوچکی تھیں، حقیقی تہذیب و تمدن میں رشتوں کا تعین قیصر و کسریٰ کے ایران و توران سے مختلف نہ ہوتا تھا ۔ روزہ نماز کی پابندی یا مسجدوں کی تعمیر ہی اسلام کی یادگار رہ گئے تھے ورنہ عملاً اسلام سے کچھ باقی نہ بچا تھا ۔ وہ صرف اللہ کی کتاب اور حدیث رسول میں محفوظ تھا ۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کی تہذیب فرشی سلام دمدمہ و نوبت کی تہذیب رہی، جس میں مراتب کا تعین، رہن سہن، رسم و رواج، شعور اور رجحان، غرض زندگی کے ہر رخ میں بنیادی انسانی قدروں کا حصول ناممکن تھا، انفرادی حوصلہ مندی کی گنجائش نہ تھی، کسی زبردست تحریک کے پروان چڑھنے کے مواقع نہ تھے، امتیازات پر سماجی ڈھانچے کی بنیاد تھی، تعمیری صلاحیتوں پر تقلید جامد کا افعی پھن پھیلائے بیٹھا رہتا تھا ۔ ایسے ورثہ کو لیکر ہم کیا کریں ؟

اصل یہ ہے کہ پاکستان کے مستقبل کا انحصار نصب العین کی وحدت پر ہے جس سے اسکی حقیقی عینیت رفتہ رفتہ ہی ابھر کر سامنے آئیگی ۔ مگر جو کچھ ہم کر سکتے ہیں وہ یہ ہی ہے کہ اسلام کے نظام اقدار اور اسکے

بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق پورے عمرانی انقلاب کے لئے جدو جہد کریں۔

خود جمیل جالبی کہتے ہیں کہ ''مذہبی اصول و عقائد کی ہماری زندگی میں بنیادی اہمیت ہے۔جب کوئی معاشرہ ان عقائد و اصول، اس نظام فکر و عمل کو حیات کا زندہ قانون بنا کر اپنی زندگی کو اسکے مطابق متشکل کرتا ہے اور اپنے احساس کو اسکے سانچہ میں ڈھالتا ہے تو اس عمل سے وہ ایک ممتاز کلچر کو جنم دیتا ہے،، جسے ہم اس نظام حیات کا کلچر کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کیوں نہ ہم ڈھلی کی زوال پذیر تہذیب کا وارث ہونے کے بجائے اس زندہ کلچر کی تخلیق کو ہی اپنا نصب العین بنائیں اور اپنی آنے والی نسلوں کو اسکا وارث بنائیں جسکی اساس سدرۃ المنتہی سے بھی پرے نبوت محمدی پر قائم ہے ؟

(زاھد)

IQBAL ACADEMY PAKISTAN
LIBRARY
Acc. No 17,001
LAHORE.

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006